مجموعہ کلام

ضیاء جبل پوری

زیرِاہتمام "گونج" پبلیکیشنز ـــ نظام آباد

طباعت : دائرہ الکٹرک پریس حیدرآباد

کتابت : محمد عبدالاحد فاروقی

بائینڈنگ : حفیظ بائینڈنگ ورکس ـ حیدرآباد

ٹائیٹل : آرتی پریس ـ نظام آباد

سنہ اشاعت ڈسمبر ۱۹۹۴ء

قیمت : ۲۵ روپے

ملنے کے پتے :

۱۔ مصنف : مکان نمبر 104-2-1 نزد مدینہ مسجد قدیم بس اسٹانڈ کاماریڈی

۲۔ دفتر "گونج" ـــ اعظم روڈ نظام آباد

یہ کتاب اردو اکیڈیمی آندھرا پردیش کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی

مودبانہ التماس

ان عظیم ہستیوں کے نام

مولانا جلال الدین رومیؒ

علامہ اقبالؒ

ڈاگ ہمارکس شولڈ

لیو ۔ ٹھانٹ

رابندر ناتھ ٹیگور

مدر ٹریسا

اور

جمی کارٹر

ضیاء جبل پوری

یونیورسٹی آف حیدرآباد

● میں آپ سے واقف نہیں۔ اس سے پہلے آپ کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ خیال تھا کہ اس غیر معروف شاعر کا کلام یوں ہی ہوگا۔ لیکن کتاب کے اندر دیکھا تو خوشگوار حیرت ہوئی۔ توقع نہ تھی۔ اتنی اچھی غزلیں ہیں۔ صفحہ ۲۴، ۳۴، ۳۵ اور ۳۶ کی غزلیں دیکھئے۔ واہ۔ میں کبھی نامستحق داد نہیں دیتا۔ آپ کے اشعار واقعی پسند آئے اس لئے مجبور ہو گیا ہوں اور سکوتِ سخن شناس اختیار نہیں کر سکتا۔

گیان چند جین
یونیورسٹی آف حیدرآباد

۲۴۔ نامساعد وقت تھا موسم کی مجبوری بھی تھی

۳۴۔ غم کی مدت نہ بڑھا چاند پگھل جائے گا

۳۵۔ ہر دن وہی پرانی دُعا اور کچھ کہو

۳۶۔ شاخِ گل بار پہ سراب اُگے

لندن
۱۸؍اگست ۱۹۹۴ء

● "ضیا جبل پوری کے کوئی بیس سال (۱۹۷۳ - ۱۹۹۳ء) کے کلام کا ایک مختصر سا انتخاب میری نظر سے گذرا۔ وہ ایک خوش گو شاعر ہیں۔ وہ جو بات اور جس طرح کہنا چاہتے ہیں کہہ لیتے ہیں۔ اُن کی زبان صاف ستھری اور ان کا کلام اسقام سے پاک ہے۔ اُن کے یہاں غمِ جاناں سے زیادہ غمِ دوراں کا چرچا ہے۔ اس کی وجہ سے ان کے کلام میں سماجی خرابیوں کا تذکرہ ہے۔ اُس میں طنز زیادہ ہے اور مزاح کم۔ اس لئے اس میں تلخی ہے۔ اگر وہ زیادہ ہمت سے کام لیں تو اس تلخاب کو نوشابہ بنا دیں۔

ضیاؔ جبل پوری کا کلام اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ وہ اتنی ہی بات کرتے ہیں جتنی ضرورت ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ وہ کیا اور کیوں کہہ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن کا کلام قدر کی نگاہوں سے دیکھا جائے گا اردو کو ایسے شاعروں کی ضرورت ہے۔"

محمد ضیاء الدین شکیب
Dr. M. Z. A. Shakeeb,
26 Croft House Third Avenue
LONDON W10 4SN.

● آج جب کہ بیشتر جدید شعراء اپنی کلاسیکی روایات اور قدیم ادبی ورثہ سے نابلد ہیں اور ان کی غزلوں میں زبان و بیان اور عروض کی بے شمار غلطیاں نظر آتی ہیں۔ ایسے دور میں ضیاءؔ جبل پوری کے کلام میں کلاسیکی رچاؤ اور فنی پختگی کو دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ضیاءؔ کی غزلوں کی بعض ردیفیں میرؔ اور سوداؔ کے لہجے کی یاد تازہ کرتی ہیں مثلاً جائے اور آوے ہے جیسی ردیفوں میں بڑے خوبصورت شعر کہے ہیں اور اس طرح اس کلاسیکی لب و لہجے کو نئی معنویت اور تازگی عطا کی ہے۔ ان ردیفوں میں دو شعر دیکھئے ؎

بھیگی بھیگی رات جب ناگن سی بل کھائے ہے ؛ من کو ساون کی جھڑی کچھ اور ترسا جائے ہے
مجھ سے پتھر کو جلا دے کے بنایا مجنوں ؛ میری لیلیٰ کو ضیاءؔ شیشہ گری آوے ہے

ضیاءؔ کے کلاسیکی لب و لہجے سے یہ اندازہ لگانا غلط ہوگا کہ انھیں بدلتی ہوئی ادبی قدروں کا احساس نہیں ہے۔ دراصل ضیاءؔ پرانی روایات اور اقدار کی توسیع و تجدید کے علمبردار ہیں۔ پرانی قدروں کو وہ نئی معنویت عطا کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ خود کہتے ہیں ؎

خشک ہونٹوں پہ تبسم تو سجا رکھا ہے
گرد آنکھوں کے جو حلقے ہیں انھیں کیا کہئے

—

روایتوں کے سمندر کھنگالتے چلئے
ملیں جو سیپ میں موتی نکالتے چلئے

—

ہوا کا تیز جھونکا کہہ گیا ہے
تمہارے پاس اب کیا رہ گیا ہے

صدف سے نئے اور آبدار موتی نکالنا ضیاء کو خوب آتا ہے اور یہی انداز اُن کے فن کی انفرادیت کو نمایاں کرتا ہے۔ دورِ حاضر کے موجودہ سیاسی نظام میں انسانی اقدار کو جس طرح پامال کیا جا رہا ہے۔ اور آزاد معاشرے کے احساس اور باشعور شہریوں اور قلم کاروں کے احساسات اور جذبات کو جس طرح مجروح کیا جا رہا ہے۔ اس کا احساس ضیاء کو بھی ہے۔ چناں چہ اس صورتحال کی عکاسی ضیاء نے اپنی غزلوں میں بہت موثر انداز سے کی ہے

ظلمتیں جب چھا گئیں اہلِ قلم پر اے ضیاء = ظلم کی تعریف میں رطب اللساں ہونا پڑا
آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر = بادشاہوں نے کبھی ایسا ستم ڈھایا نہ تھا
انقلابی بن رہے ہیں دشمنانِ انقلاب = ایسا دھوکا تو زمانے نے کبھی کھایا نہ تھا

امن اور انسانیت کے نام سے ڈرتے ہیں لوگ
یہ تاثر تو کبھی الفاظ نے پایا نہ تھا

جیپ پھر آئی ہے میرے گاؤں میں = آگیا نزدیک شاید انتخاب

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ضیاء جبل پوری ایک سچے شاعر ہیں۔ ایک سچے شاعر کا مل جانا نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ۔۔۔۔۔

احتشام اختر
کوٹہ (راجستھان)

سید ہاشم علی

سابق وائس چانسلر علیگڈھ مسلم یونیورسٹی
وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی
پرنسپل سکریٹری حکومت آندھرا پردیش

شکاگو ایریا
۲۰ ستمبر ۱۹۹۴ء

● جناب محمد ضیاء الدین ضیاء جبل پوری کا یہ دوسرا مجموعہ کلام "کوہِ نور" جو "بیاضِ فکر" کے بعد شائع ہو رہا ہے۔ اردو شاعری میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔ ہندوستان میں اردو زبان جس دور سے گذر رہی ہے۔ اس میں ثقیل اور مشکل الفاظ کی بجائے سادگی کی ضرورت ہے اور یہ بات ضیاء کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ زندگی کے تیزی سے بدلتے ہوئے حالات پر بھی اُن کی نظر ہے اور ایسے اشعار پڑھنے والے پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے

بن باس تو دنیا کو دکھانے کے لئے ہے = تیاریاں راون کو مٹانے کے لئے ہیں
ہوئے ہیں چار ہی دن اس کو منتخب ہو کر = وہ شخص پہلے کبھی جھوٹ بولتا تو نہ تھا
وہ جماعت کم تھی کیا لیتی کسی سے انتقام = زخم کھا کر دستِ قاتل کو دُعا دیتی گئی
آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر = بادشاہوں نے کبھی ایسا ستم ڈھایا نہ تھا

ضیاء صاحب نے چند غزلیں بھیجی تھیں۔ ان میں سے کئی شعر مجھے پسند آئے اور ان میں سے چند یہ ہیں۔

دنیا پسند قوم کو مذہب سے کیا غرض = دیر و حرم کی ہم کو ضرورت نہیں رہی
شدت تشنہ لبی آپ ہے اپنی معراج = لوگ پیاسوں کو بھی میخوار سمجھ لیتے ہیں
مشورہ تیرا بجا ہے مگر اے جراتِ شوق = اس زمانے میں تو ہنستے ہوئے جی ڈرتا ہے

یہ موجِ ہوا، نکہتِ گل، نغمۂ بلبل = عنوان یہ سارے ترے آنے کیلئے ہیں

بندوں کے واسطے بڑا نازک مقام ہے = سنتے ہیں سو رہا ہے خدا جاگتے رہو

گردشِ دوراں نے سمجھا ہے مجھے میں نے اسے = میں جدھر بڑھتا گیا، وہ راستہ دیتی گئی

عشق جا پہنچا فرازِ دار تک = حسن چھلکا تھا فرازِ بام سے

تیری نیت کو سمجھتا ہے بڑا دانا ہے = اس کو سجدوں سے نہ بہلا کہ خدا ہے وہ بھی

تڑپ تڑپ کے مرا ہے وہ روشنی کے لئے = سیاہ رات میں جو آفتاب جیسا تھا

سرِ نظر ترا چہرہ سرِ قدم تری یاد = نفس نفس تری آواز پا لگے ہے مجھے

دست و بازو اگر نہیں بخشے = سر کٹاتے کا حوصلہ بھی دے

میری دعا ہے کہ ضیاء جبل پوری اردو کے جدید شاعروں میں ایک اونچا مقام حاصل کریں۔

ہاشم علی اختر

۳۰ - ۹ - ۹۴ء

پیش لفظ

ضیاءؔ جبل پوری ہمارے ادبی حلقوں میں ایک خاصہ شناسا نام ہے۔ اُن کا
پہلا شعری مجموعہ سنہ ۱۹۸۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اور اب یہ دوسرا مجموعۂ کلام آپ کے پیش نظر
ہے۔ وہ ایک عرصہ دراز سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اور اپنے مخصوص طرزِ فکر اور اندازِ بیان
سے اپنی ایک انفرادی شناخت بنا رہے ہیں ــــ ویسے ضیاءؔ جبل پوری نے کئی بہت
اچھی نظمیں تخلیق کی ہیں لیکن اُن کا فطری رجحان غزل کی طرف معلوم ہوتا ہے
یہ صحیح ہے کہ ہمارے یہاں ہر مبتدی شاعر اپنی شعر گوئی کا آغاز غزل ہی سے
کرتا ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غزل ہماری شاعری کی ایسی صنف ہے جو آسانی سے
قابو میں نہیں آتی ــــ غزل کا فن ایک رچے ہوئے شعری مزاج، ایک تربیت یافتہ
ذوق، گہرے مطالعے، اور فنی "ریاضت" کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایک نظم گو شاعر کے مقابلے میں
ایک غزل گو شاعر کے لئے اپنی شعری روایات و مسلمات سے کما حقہٗ واقف ہونا
زیادہ ضروری ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ اپنی شعری روایات سے محض واجبی سی آگہی
کے ساتھ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایک کامیاب نظم کہہ لے لیکن ایک کامیاب غزل کہنا ممکن
نہیں ــــ اس بات سے انکار نہیں کہ غزل کی صنف میں بھی تجربے ہوئے ہیں اور تبدیلیاں
آئی ہیں اور بہت اچھی تبدیلیاں آئی ہیں لیکن غزل کا رشتہ اپنی روایات سے ٹوٹا
نہیں، ــــ ایسا ممکن بھی نہیں ہے ــــ "آزاد غزل" کے تجربے کی عدم مقبولیت اور

ناکامی اس کا ثبوت ہے ـــ غزل کا مزاج اس طرح کی تبدیلیوں اور تجربوں کا متحمل نہیں ہو سکتی ـــ ایک اچھی غزل کہنے کے لئے آداب غزل کا پاس و لحاظ بھی ضروری ہے اور عصری حالات و مسائل سے آگہی بھی فکر و احساس کی آنچ بھی چاہیئے اور اظہار کا سلیقہ بھی ـــ

ضیاءؔ جبلپوری کی غزلیں پڑھیئے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس نکتے سے واقف ہیں ـ انہوں نے اس صنف میں کوئی تجربے تو نہیں کئے لیکن اس کو بڑی سلامت روی کے ساتھ برتا ہے ـ اُن کی غزلوں میں کہیں کہیں بلند آہنگی بھی محسوس ہوتی ہے. خاص طور پر جہاں جذبے کی شدّت حاوی ہے

ضیاءؔ جبل پوری کے یہاں ہم کو خود آگہی بھی ملتی ہے اور حیات و کائنات کا درک بھی ـ دور جدید کی مادّہ پرستی نے ہمارے معاشرے میں جس بے حسی اور بے بصری کو پروان چڑھایا ہے اس کا عکس بھی ہم کو ان کے اشعار میں نظر آتا ہے ـــ ان کی شاعری میں عصر حاضر کا کرب، گھٹن اور ناآسودگی کا احساس نمایاں ہے ـ لیکن بہت اچھی بات یہ ہے کہ شاعر مایوسی کا شکار نہیں ہے ـ وہ ایک پُروقار حوصلہ رکھتا ہے۔ اور اس کی یہی رجائیت ریگ زار کے صبر آزما سفر میں نخلستاں بھی تلاش کر لیتی ہے اور شاعر کا ذوقِ جمال جاگتا ہے ـ ضیاءؔ جبل پوری زندگی کی محض ایک جہت کے قیدی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو پر ان کی نظر ہے ـ

ضیاءؔ جبل پوری کے یہاں لفظوں کو برتنے کا سلیقہ ہے ـ اُن کے لہجے اور طرز اظہار میں بڑی سنجیدگی اور خود اعتمادی ہے اور میں اُن کی اس خود اعتمادی ہی کو اُن کا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتا ہوں ـ یہ چیز اُن کے بیشتر اشعار میں نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے اور یہی چیز اُن کے شعری سفر میں اُن کی انفرادیت کو متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوگی ـــ

میں آخر میں ضیاء جبل پوری کی غزلوں سے ایک مختصر سا انتخاب پیش کرتا ہوں۔ تاکہ اُن کی شاعری کے بارے میں میرے ان تاثرات کی وضاحت ہو سکے۔

دھوپ دی ہے تو سائباں بھی دے = جو ہیں بے گھر انہیں مکاں بھی دے

پھول عریاں بھی ہے ملبوس میں مستور بھی ہے = اس سلیقے سے کسے جامہ دری آوے ہے

ان کے دامن میں سلامت تو نہ فرزانہ سمجھ = چند دیوانوں کو بھی بخیہ گری آوے ہے

انقلابات نے ظالم کو بنایا منصف = اور مظلوم کو دُرّوں کی سزائیں دی ہیں

ہمارے ظرف کی وسعت کہ پاسِ عہدِ وفا = فریب کھائے ہوئے ہیں فریب کھانا ہے

آرام گیا، نیند گئی، صبر و سکوں بھی = کیا ہم پہ کوئی قہرِ خدا ٹوٹ رہا ہے؟

مہکے ہوں پھول جیسے کہیں لاشعور میں = یوں آرہی ہے آج کسی گلبدن کی یاد

آگ پانی میں لگا کر دیکھیں = اُس کو آئینہ دکھا کر دیکھیں

میں نے سیرابی کی لذّت پائی ہے = اے ندی تجھ کو بتا کیسا لگا

میخواروں سے نسبت ٹھہری میخانے میخانے ٹھہرے = تشنہ لبوں کو دیکھ کے چھلکے پیمانے پیمانے ٹھہرے

رُخ سے نقاب رخ کو اٹھا کر سامنے آؤ تو ہم جانیں = اُڑتی ہوئی شہرت تو سنی ہے افسانے افسانے ٹھہرے

ٹوٹ کر بکھرا سہی ہر حال میں سچ بولتا ہے = کیوں نہ ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرہ دیکھوں

ڈاکٹر مقبول فاروقی
شعبۂ اردو، آندھرا یونیورسٹی
والٹیر

۱۹ ستمبر ۱۹۹۴ء

● حیدرآباد کے شعری افق پر ۱۹۷۰ء کے بعد جو شاعر نمایاں ہوئے ہیں ان میں سے ایک نام ضیاؔء جبل پوری کا ہے۔ ضیاؔء صاحب نے مختلف رسالوں میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا۔ ویسے تو وہ مرادآباد کے رہنے والے ہیں لیکن بعض حالات کی وجہ سے وہ حیدرآباد منتقل ہوگئے اور ان کا شعری سفر بھی دکن میں شروع ہوا۔ ہند و پاک کے جرائد میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

یوں تو حیدرآباد فرخندہ بنیاد کا ہر ضلع ادبی دنیا میں اپنا ایک مقام رکھتا ہے جیسے محبوب نگر، کریمنگر، ورنگل اور نظام آباد کے شعراء نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے فکر و تخیل پر کسی کی میراث نہیں ہے یہ تو ذہانت و شعری صلاحیت اور زاویہ نگاہ کا فرق ہے۔ آپ اگر ضیاؔء جبل پوری کا کلام دیکھیں تو یہ محسوس نہیں ہوگا کہ وہ ادبی مرکز سے دور ہیں وہ نظم اور غزل دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں وہ فارمولہ شاعری کے قائل نہیں بلکہ جدیدیت اور ترقی پسندی کا لیبل بھی اپنے اوپر لگانا نہیں چاہتے کیونکہ لیبل لگاکر کوئی اچھی شاعری نہیں کرسکتا۔ اسکے بغیر بھی اچھی شاعری ہوسکتی ہے جیسے.. اخترالایمان اور ترقی پسندوں میں مخدوم و فیض وغیرہ ہیں یہی حال ضیاؔء جبل پوری کا ہے۔ ان کے یہاں مضامین اپنی ندرت کی بدولت کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں ؎

حاکم وقت نے مجمع میں سزائیں دی ہیں = ہم نے ہر حال میں خلقت کو دعائیں دی ہیں
انقلابات نے ظالم کو بنایا منصف = اور مظلوم کو دُرّوں کی سزائیں دی ہیں

آج کل غزل کی دنیا میں عصری حسیّت کم نظر آرہی ہے۔ عصری حسیّت اور مسائل کو سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ مخدوم نے بخشا ہے۔ کیونکہ مخدوم کے یہاں کوئی نعرہ بازی قسم کی شاعری نہیں ملتی لیکن ادبی درجہ کی ترقی پسند شاعری کے نمونے اور

شہکار مخدوم اور فیض کے یہاں مل جائیں گے یہی اثر نوجواں نسل نے بھی قبول کیا اور ضیاءؔ جبل پوری کے یہاں دیکھیے لہجہ اور میرؔ کے انداز میں کئی شعر قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں جیسے ؎

میخواروں سے نسبت ٹھہری میخانے میخانے ٹھہرے = تشنہ لبوں کو دیکھ کے چھلکے پیمانے پیمانے ٹھہرے

یہ پوچھو ان کی محفل میں فرزانوں پر کیا گزری ہے = دیوانوں کی بات نہ پوچھو دیوانے دیوانے ٹھہرے

یہ دھیمہ لہجہ ضیاءؔ کی خاصیت معلوم ہوتا ہے ان کے یہاں بات کہنے کا اک نرالا ڈھنگ ہے جو تغزل کو بھی قائم رکھتا ہے اور مضمون کے تیکھے پن کو بھی برقرار رکھتا ہے ان کے یہاں خود اعتمادی بدرجہ اتم موجود ہے ؎

اس میں تخریب کا پیغام نہ پوشیدہ ہو = فاختہ لیکے کوئی شاخ ہری آوے ہے

جیوں عریاں بھی ہے ملبوس میں مستور بھی ہے = اس سلیقہ سے کسے جامہ دری آوے ہے

ایک انداز تکلم دیکھیے جو مکالماتی انداز ہے ۔ اس خود کلامی میں قاری کو اپنائیت کا احساس ہوتا ہے ۔ اور شاعر کو اپنی محرومی کا ؎

ہجر کی کتنی کڑی لمبی سزا تھی تم نہ تھے = رات بھر جس نے مجھے چھیڑا ہوا تھی تم نہ تھے

میں ضیاءؔ پلکیں بچھا کر گوش برآواز تھا = صرف مستقبل کے قدموں کی صدا تھی تم نہ تھے

زمانے کی ستم ظریفی اور اس عہد کی بے مروتی پر ضیاءؔ کے جذبات ملاحظہ کیجیے ؎

ہم سے ملتا ہے زمانہ جو رقیبانہ ملے = ہم زمانے سے ملے ہیں تو شریفانہ ملے

دیکھیے پھر دست قاتل سے پکارے ہے لہو = سوچیے تاریخ کیوں اپنے کو دہرا رہی ہے

ضیاءؔ جبل پوری فطری شاعر ہیں ۔ ان کے یہاں آمد ہے آورد نہیں ۔ روایتی انداز سے ضیاءؔ کو بچنا چاہیے کیوں کہ زندگی کے متعلق ان کا مطالعہ بڑا گہرا ہے ۔ غزل کے میدان میں ان کے جوہر زیادہ نکھرتے ہیں ؎

اپنی پلکوں پہ کوئی خواب سجائے رکھئے = اپنے خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھئے
عین ممکن ہے بہاروں کا گذر ہو جائے = خانۂ دل کے در و بام سجائے رکھئے

ایک خوبصورت مضمون ملاحظہ کیجئے۔

حدودِ شام میں سورج نے خودکشی کر لی = گھٹن کے کرب سے چہروں پہ دھوپ پھیلی ہے
ضیاء کے قتل سے دشتِ شفق میں ہے سرخی = جو ذات ٹوٹ کے بکھری حیات نکھری ہے

بعض وقت ضیاء صاحب خوبصورت انداز سے عمیق بات کہہ جاتے ہیں دیکھنے میں تو معمولی خیال لگتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو ایک جہانِ معنی و رنگ روبرو کھلتا جاتا ہے

نکلی ہے آج قوسِ قزح آن بان سے = یا آسماں کو آئی ترے بانکپن کی یاد
رات کی رانی بھی تسکیں نہ دیتی ہوگی = زخمِ یادوں کا سرِ شام مہکتا ہوگا

ضیاء جبل پوری کا پہلا مجموعہ کلام "بیاضِ فکر" شائع ہو کر ادبی دنیا سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے اب دوسرا مجموعہ کلام شائع ہو رہا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعہ کلام پر مبارکباد دیتے ہوئے اس پیش لفظ کو ختم کرتا ہوں۔

امیر عارفی
شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی
دہلی

عکس اور عکاس

ضیاء حبل پوری جن کا پورا نام محمد ضیاء الدین ہے یکم دسمبر ۱۹۳۲ء
کو حضرت جگر مراد آبادی کے وطن مراد آباد (یو۔پی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد
جناب محمد ناصر الدین مشہور حکیم تھے۔ ضیاء صاحب کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔
انٹر کے بعد محکمہ ریلوے سے وابستہ ہو گئے اور گزشتہ ۲۵ برسوں سے نظام آباد
ضلع میں مقیم ہیں اور یہاں کی ادبی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔ دو برس قبل آپ
بحیثیت اسٹیشن ماسٹر کاماریڈی وظیفہ حسن خدمت پر ملازمت سے سبکدوش ہو گئے
کاماریڈی (ضلع نظام آباد) ضیاء حبل پوری صاحب کا وطن ثانی ہو گیا۔

ضیاء صاحب کو بچپن ہی سے اپنے اطراف شعری ماحول ملا۔ آپ اس ماحول
سے بچ نہ سکے اور طالب علمی کے دور ہی سے شعر کہنے لگے۔ آپ کی تخلیقات ملک اور
بیرون ملک کے رسائل و جرائد میں مسلسل چھپتی رہتی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ ہندی
اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ آپ کے کلام کا انتخاب "بیاض فکر" کے نام سے ۱۹۸۲ء
میں شائع ہوا اور اس مختصر سے تعارفی مجموعہ کو اردو والوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ممتاز شاعر ڈاکٹر محبوب راہی نے ضیاء صاحب کے کلام پر اپنی رائے کا اظہار
کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ضیاء صاحب نے جدیدیت کو فیشن اور فارمولے کے طور پر نہیں
اپنایا ہے۔ تقلیدیوں کی طرح موضوعات اور علامات کی جگالی سے پرہیز کرتے ہوئے وہ
جدید تقاضوں کو سمجھنے کا شعور رکھتے ہیں۔ زندگی کے پیش آمدہ مسائل کی کچھ گہرائیوں

میں اترتے ہیں۔ عصری حسیت سے واقف ہیں لوز شب پر ان کی نگاہ ہے۔ انکا سماجی شعور بیدار ہے وہ جدید تقاضوں کو سمجھنے اور پرکھنے کیلئے بصیرت اور بصارت دونوں سے بہرہ مند ہیں۔ ـــــــ ضیاء صاحب مبہم علامات، مہمل اشاریت بعید از قیاس واقعات ناقابل فہم اور دوراز کار پیچیدہ طرز بیان عجیب وغریب نامانوس اور بے ہنگم الفاظ اور جناتی زبان کو جوڑ توڑ کر اپنی شاعری پر نام نہاد جدیدیت کا لیبل لگانے کی بجائے صالح روایات کی زرخیز مٹی پر جدید اشعار کے رنگا رنگ گل بوٹے کھلاتے ہیں۔ الفاظ ومعانی تک ان کی رسائی ہے۔"

ڈاکٹر محبوب راہی صاحب کے ان خیالات سے مکمل طور پر اتفاق کرتے ہوئے ضیاء صاحب کے تعلق سے میں اپنی طرف سے بس اتنا ہی کہوں گا کہ ضیاء صاحب ابتداء ہی سے میرے پسندیدہ شاعر رہے ہیں۔ مجھے ہمیشہ ان سے مل کر اور ان کا کلام سن کر خوشی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔

یہ بات میرے لئے باعث افتخار ہے کہ "کوہِ نور" کی اشاعت گورنج پبلیکیشنز کے زیر اہتمام عمل میں آرہی ہے۔

جمیل نظام آبادی یم۔اے
مدیر "گونج" نظام آباد

۲۳ ستمبر ۱۹۹۴ء

مناجات

دشت میں پھول اب کھلا ہی دے
دل کو اک زخمِ گل نما ہی دے
ان رقیبوں کو تاہ راہِ وفا
از رہ مصلحت تباہی دے

جنسِ نایاب ہے کہاں ڈھونڈوں
کوئی محبوب بے وفا ہی دے
گر مناسب نہیں ہے سیم و زر
علم و محنت کی کیمیا ہی دے

کوئی منظر مجھے دکھا لیکن
قلب کو میرے خوش نگاہی دے
نالۂ نیم شب اگر ہے گراں
اک سبک آہِ صبح گاہی دے

دست و بازو اگر نہیں بخشے
سر کٹانے کا حوصلہ ہی دے
زندگی بن گئی شبِ ہجراں
دل کے داغوں کو کچھ ضیا ہی دے

نعت شریف

اپنی راہوں میں ترا نقشِ قدم رکھا ہے
میں نے نظروں میں سدا باغِ ارم رکھا ہے

ہم گنہ گاروں کو نسبت ہے ترے نام کے ساتھ
تو نے ہر حال میں امت کا بھرم رکھا ہے

تیری تعلیم و ہدایت، تری رحمت، تیرا فیض
سارے عالم کے لئے تیرا کرم رکھا ہے

سجدہ شوق سلامت ہے، تو دل آنکھیں کھول
ہاں! مدینہ میں بھی اک بابِ حرم رکھا ہے

بادشاہوں کے وہاں تاج بھی جھک جاتے ہیں
جس جگہ تیرے غلاموں نے قدم رکھا ہے

میرے مالک تری توحید کے قربان ضیاءؔ
کعبۂ دل میں مرے ایک صنم رکھا ہے

رحمۃ للعلمین

غلغلہ سا اٹھا
زلزلہ آ گیا
اور لبوں پہ فرشتوں کے
تسبیح حق تیز تر ہو گئی

وہ فرشتہ جو ہے
صور تھامے ہوئے
مستعد ہو گیا
بند توبہ کا دروازہ ہونے لگا
چاند سورج ڈرے
کہکشاں سہم کر، زرد پڑنے لگی
سب یہ سمجھے قیامت قریب آ گئی

کیا ہوا، کیوں ہوا، اور کیسے ہوا
کچھ فرشتوں نے سرگوشیوں میں کہا

وہ یتیم آمنہؓ کا خدا کا نبی
آج طائف کی گلیوں میں زخمی ہوا

اُن کی ہمت کا یہ حوصلہ دیکھئے
دشمنوں کو جو دی ہے سزا دیکھئے
اُن کے اخلاق کا مرتبہ دیکھئے
اُن کی رحمت کا ہے معجزہ دیکھئے

ہاتھ اٹھے اور لب سے یہ نکلی دعا
میرے پروردگار اِن کو رستہ دِکھا
میرے اللہ ان کی خطا معاف کر
یہ نہیں جانتے کر رہے ہیں یہ کیا؟

نذرِ عقیدت

بحرِ استبداد میں مردِ خدا درکار تھا
کشتیٔ انسانیت کو ناخدا درکار تھا

راہِ ہستی کو تڑپ تھی کوئی سنگِ میل ہو
کاروانِ وقت کو اِک نقش پا درکار تھا

آنے والا ہر یزیدِ وقت عریاں ہو گیا
صفحۂ تاریخ کو اِک آئینہ درکار تھا

کربلا کب وقت اور جغرافیہ میں قید ہے
مالکِ لوح و قلم کو حاشیہ درکار تھا

تا قیامت تشنگی کی لاج رکھنے کے لئے
بانیٔ جمہور شاہِ کربلا درکار تھا

عشق کی محفل نہایت پر ضیا تھی تم نہ تھے
قیس اور فرہاد تھے میں تھا وفا تھی تم نہ تھے

ہجر کی کتنی کڑی، لمبی سزا تھی، تم نہ تھے
رات بھر جس نے مجھے چھیڑا ہوا تھی، تم نہ تھے

عمر بھر محرومیاں، ناکامیاں، مجبوریاں
گردشِ دوراں نہایت باوفا تھی تم نہ تھے

خوش لباسی، خوشنمائی، تازگی، زندہ دلی
موسمِ گل میں تمہاری ہر ادا تھی تم نہ تھے

ٹیس کیا، کرب و کسک، رنج و محن، درد و خلش
میری قسمت زندگی کی ہر عطا تھی، تم نہ تھے

جب ضیاءؔ پلکیں بچھا کر، گوش بر آواز تھا
صرف مستقبل کے قدموں کی صدا تھی، تم نہ تھے

ناموافق وقت تھا موسم کی مجبوری بھی تھی
بادِ صرصر بھی تھی خزاں بھی عقل سے دوری بھی تھی

برگِ آوارہ بنا سازش نہ ٹوٹا شاخ سے
اِس میں پورے پیڑ کی خاموش منظوری بھی تھی

وقت کے حاکم کا تھا کچھ ہاتھ کچھ تقدیر کا
دار تک جو لے گئی وہ شانِ منصوری بھی تھی

چھن گئی جب جاگیر مجھ کو نوکری کرنی پڑی
یوں تو میری منتظر سڑکوں پہ مزدوری بھی تھی

عمر کے رشتے بھلا اِک پل میں کیسے ٹوٹتے
ذہن میں مقراضِ شک تھی دل میں مجبوری بھی تھی

کامیابی حیل کے اٹھی تھی ترے در تک ضیاء
تیری ناکامی میں شامل تیری مخموری بھی تھی

بساطِ ہوش و خرد کس قدر ادھوری ہے
مِری نہیں مری منزل کی ٹانگ ٹوٹی ہے

زمیں فکر و نظر کے حقیر ذرّوں سے
حصارِ ذات کے سورج نے بھیک مانگی ہے

خلاء کی گرد بنی نور میرے چہرے کا
صلیبِ وقت صدا میرے خوں کی پیاسی ہے

سفر مدام سفر تیر نہیں سمندر کی
ازل سے میری انا مجھ کو لے کے ڈوبی ہے

حدودِ شام میں سورج نے خودکشی کر لی
گھٹن کے کرب سے چہروں پہ دھوپ پھیلی ہے

ضیاء کے قتل سے دستِ شفق میں سرخی ہے
جو ذات ٹوٹ کے بکھری حیات بکھری ہے

میں گرد گرد نہیں قیس کو بکو کی طرح
تمہارے دل میں ہوں میں نخلِ آرزو کی طرح

ترا وجود بجز تشنگی کچھ اور بھی ہے
میں تیرے قرب سے بہتا ہوں آبِ جو کی طرح

نمازِ عشق کی پاکیزگی سے واقف ہوں
ترا خیال ہے میرے لئے وضو کی طرح

میں بے زبان اِدھر، اور آپ، مُہر بلب
خموشیوں کے بھی دفتر ہیں گفتگو کی طرح

پھٹے لباس میں رہ کر بھی بیش قیمت ہوں
کسی غریب کے ایمان و آبرو کی طرح

اُبل رہا ہے سراپا بہ فیضِ موسمِ گل
چھلک رہی ہے جوانی بھرے سبُو کی طرح

کسی کے دل کے دریچے میں مثلِ گل ہے ضیاؔ
حنیں ہے دستِ حنائی میں وہ لہو کی طرح

میخواروں سے نسبت ٹھہری، میخانے میخانے ٹھہرے
تشنہ لبوں کو دیکھ کے چھلکے پیمانے پیمانے ٹھہرے

یہ پوچھو ان کی محفل میں، فرزانوں پر کیا کیا گذری
دیوانوں کی بات نہ پوچھو، دیوانے دیوانے ٹھہرے

رُخ سے نقابِ رخ کو ہٹا کر سامنے آؤ تو ہم جانیں
اُڑتی ہوئی شہرت تو سنی ہے افسانے افسانے ٹھہرے

ہوش و خرد کو ہم کیا جانیں سود و زیاں کو کیا پہچانیں
جان تصدق کر دیتے ہیں پروانے پروانے ٹھہرے

تو ہے ضیاء کا ناز ہے تجھ پر اُسکو بتوں سے کب شکوہ ہے
جب تو نے ہی بات نہ پوچھی، بیگانے بیگانے ٹھہرے

غم نہ اتنا ہو کہ ہر فکر سے بے غم کر دے
میرے اللہ! ذرا میرا نشہ کم کر دے

پیارے محبوب کے صدقے میں کرم ہو مجھ پر
دل کو آئینہ بنا چشم کو پرنم کر دے

یہ جو موتی مری آنکھوں کو دئیے ہیں تو نے
ان کو گلہائے سخن پر دُرِ شبنم کر دے

نسبت شیر خدا دی ہے تو ان بچوں کی
فکر فردا کو عطاء جراتِ ضیغم کر دے

فرض ہے جہدِ بقاء میں مرا حصہ لینا
میرے زخموں کو عطاء وقت کا مرہم کر دے

انقلابات تری مست نگاہی پہ نثار
ساقیا دور چلے، زلف کو برہم کر دے

وقت بے چارہ ہے، بوڑھا ہے، نہ پیچھے رہ جائے
اب ذرا جانِ ضیاء رقص کو مدھم کر دے

بتانِ سنگ مرمر بولتے ہیں
مرے سینے سے لگ کر بولتے ہیں

کہاں ہے خامشی ہی گونجتی ہے
حقیقت یہ ہے پتھر بولتے ہیں

ہے مظلوموں کے اوپر سخت پہرہ
ستم یہ ہے ستمگر بولتے ہیں

جو گھٹ کر مر گئے وہ کیا کہیں گے
مگر جلتے ہوئے گھر بولتے ہیں

لب و لہجہ بدل لیتے ہیں اپنا
وہ جب کھادی پہن کر بولتے ہیں

مرے پُرکھوں کے تاج و تخت اکثر
عجائب گھر کے اندر بولتے ہیں

ضیاءؔ معشوق میرے کم سخن تھے
رقیبوں کی وہ شہ پر بولتے ہیں

روشنی کھو کے ضیائے دیدہ وری آوے ہے
بعد لٹنے کے ہمیں راہبری آوے ہے

اس میں تخریب کا پیغام نہ پوشیدہ ہو
فاختہ لے کے کوئی شاخ ہری آوے ہے

ان کے دامن ہیں سلامت تو نہ فرزانہ سمجھ
چند دیوانوں کو بھی بخیہ گری آوے ہے

پھول عریاں بھی ہے ملبوس میں مستور بھی ہے
اس سلیقے سے کسے جامہ دری آوے ہے

مجھ سے پتھر کو جلا دے کے بنایا مجنوں
میری لیلیٰ کو ضیاء شیشہ گری آوے ہے

بھیگی بھیگی رات جب ناگن سی بل کھا جائے ہے
من کو ساون کی جھڑی کچھ اور ترسا جائے ہے

دیکھیے پھر دستِ قاتل سے پکارے ہے لہو
سوچیے! تاریخ کیوں اپنے کو دہرا جائے ہے

کہکشاں بھی درد کی شدت سے ہو جاتی ہے زرد
رات کے پچھلے پہر، جب یار تڑپا جائے ہے

تیری دوزخ سی جوانی، اے حسیں شعلہ بدن
دل میں جنت کی تمنا، اور بھڑکا جائے ہے

کب بدل جائے زمانہ، کب بکھر جائے رباب
وقت کے فرمانرواؤں پر بھی وقت آ جائے ہے

گردشِ دوراں، کبھی ملتی تو ہے لیکن ضیاءؔ
نازنیں نظریں ملا کر اور شرما جائے ہے

جناب شیخ کو دستار پارسائی ملی
کبھی بلا مجھے ساغر کبھی صراحی ملی

ملی ہے کونسی نعمت بتا نہیں سکتا
کسی کے در کی مجھے جس گھڑی گدائی ملی

ترے طفیل مجھے ذوقِ سجدہ گاہی ملا
تری عطا کہ مجھے آج بادشاہی ملی

کسی فقیر نے بخشا ہے کون سا اعجاز
خدا ملے گا یقیناً مجھے خدائی ملی

نہ دشمنوں کی شکایت نہ دوستوں کا گلہ
ملی ضیاءؔ کو جو نسبت تو خانقاہی ملی

ہم سے ملتا ہے زمانہ جو رقیبانہ ملے
ہم زمانے سے ملے ہیں تو شریفانہ ملے

ہم کسی دور میں بھی ان کے مقابل نہ رہے
چند احباب ہمیشہ ہی حریفانہ ملے

حسنِ اخلاق سے ملنا بھی جواں مردی ہے
کوئی اغیار میں، ہم سب سے رفیقانہ ملے

اس کو یہ ضد ہے کہ وہ چاند پہ تھوکے گا مگر
اس کو اطوار ہی بچپن سے مریضانہ ملے

راہ میں رکنے رکانے کے نہیں ہم قائل
چاہے مشکل کوئی آئے کہ پری خانہ ملے

وضعداری ہے ضیاء وضع پہ اپنی قائم
ہم ملے جس سے بہ انداز حبیبانہ ملے

غم کی حدت نہ بڑھا چاند پگھل جائے گا
آتشِ عشق بجھا چاند پگھل جائے گا

تیری قسمت ہے سدا دھوپ میں جلتے رہنا
اس کے رستے میں نہ جا چاند پگھل جائے گا

کرب کو چاہئے اظہار نہ ملنے پائے
ساز پر گیت نہ گا چاند پگھل جائے گا

تشنگی دیکھ کر ڈھل جائے نہ ساغر میں کہیں
جامِ خُمار نہ اٹھا چاند پگھل جائے گا

اے میری رشکِ قمر ماہ جبیں ماہ لقا
رُخ سے پردہ نہ اٹھا چاند پگھل جائے گا

تو ہے کیوں درد کے سورج کا گرفتارِ ضیاؔ
اپنے حالات بتا چاند پگھل جائے گا

ہر دن وہی پرانی دعا اور کچھ کہو
لفظوں کے سلسلے کے سوا اور کچھ کہو

بندہ ہوں مجھ سے ذکر کرو میری ذات کا
بہرِ خدا خدا کے سوا اور کچھ کہو

زخمی ہوئی کہیں یہ کہیں توڑتی ہے دم
کیسی وفا کہاں کی وفا اور کچھ کہو

گر یہ بہار ہے تو خزاں کس کا نام ہے
یہ گل کھلا ہے کوئی نیا اور کچھ کہو

لازم ہے اب کے ہاتھ اٹھیں اور لب ہلیں
بے کار ہو گئی ہے دوا اور کچھ کہو

اس دور میں یزید بھی ہے کربلا بھی ہے
تاریخ کہہ رہی ہے ضیاؔ اور کچھ کہو

شاخ گلبار پر شراب اُگے
پھر چناروں تلے شباب اُگے

آسماں پر کھلا ہے زرد گلاب
سبز کھیتوں سے آفتاب اُگے

سرزمینِ عذاب پر برسا
ابرِ رحمت تو پھر ثواب اُگے

زلفِ پیچاں کی اپنی دنیا میں
ساحرہ تاروں کے ماہتاب اُگے

عرشِ اعظم ہے ایک بنجر کھیت
اب زمیں سے نئی کتاب اُگے

ذہنِ انساں میں جب خیال آیا
پردۂ غیب سے جواب اُگے

اپنی اوقات جانتے ہو ضیاؔ
وقت سے پہلے کیوں جناب اُگے

شہرِ تنہائی میں کوئی مرے ساتھ آیا نہ تھا
میں جہاں پر تھا وہاں پر دُور تک سایہ نہ تھا

انقلابی بن رہے ہیں دشمنانِ انقلاب
ایسا دھوکا تو زمانے نے کبھی کھایا نہ تھا

قوم ساری چیختی تھی اور تم خاموش تھے
لفظ ہمدردی تمہیں دنیا نے سکھلایا نہ تھا

امن اور انسانیت کے نام سے ڈرتے ہیں لوگ
یہ تاثر جو کبھی الفاظ نے پایا نہ تھا

آپ نے جو کچھ کیا جمہوریت کے نام پر
بادشاہوں نے کبھی ایسا ستم ڈھایا نہ تھا

اپنا اپنا وقت ہے معیار ہے اور ظرف ہے
کھب گیا ہے کوئی آنکھوں میں کوئی بھایا نہ تھا

تم تنیا! ملہار کے عاشق تھے کیسے جل اٹھے
تم نے دیپک تو کبھی اس رنگ میں گایا نہ تھا

بے لوث حقیقت کو کچھ رنگِ گماں دے دو
مقتول کا لہو چپ ہے قاتل کو اماں دے دو

تھوڑی سی جگہ اُس کو دامن میں ارم دیگی
اب تم بھی دعاؤں کا اِک باغِ جناں دے دو

حالات کی چوکھٹ کو جب بھینٹ ہی دینی ہے
دو ہاتھ کی تھالی میں خود اپنی زباں دے دو

دستور سے خارج ہے پیاسوں سے رواداری
پانی جو کوئی مانگے تم آبِ سناں دے دو

جب زہر ہی دینا ہے سچ کو تو تامّل کیا
اے وقت کے سقراطو، تم چاہے جہاں دے دو

اِنصاف کا نوحہ کیا، بس میرؔ کا دوہا ہے
بہتر ہے مرے سر کو اک سنگِ گراں دے دو

تری نگاہ مرا مدعا لگے ہے مجھے
ہر ایک لحظہ نئے سال سا لگے ہے مجھے

کس اعتماد سے کانٹوں کے بیچ ہے خنداں
ہنسی کلی کی تمہاری ادا لگے ہے مجھے

ہر نظر ترا چہرہ، ہر قدم تری یاد
نفس نفس تری آوازِ پا لگے ہے مجھے

بہت سکوں سے ہوں تیرے غم کی جنت میں
ترے خیال کی ٹھنڈی ہوا لگے ہے مجھے

مزاجِ وقت نے شائد بدل دیا چولا
جبھی تو پیرِ مغاں پارسا لگے ہے مجھے

ہر ایک آنکھ دکھاتی ہے رنگ روپ مرا
ہر ایک شخص مرا آئینہ لگے ہے مجھے

یہیں پہ کیوں نہ ضیاؔ غم کی دوپہر کاٹیں
کسی کی یاد کا سایا گھنا لگے ہے مجھے

کسی کے راز سرِ بزم کھولتا تو نہ تھا
پلیک میل سے وہ زہر گھولتا تو نہ تھا

وہ اپنے گاؤں کے ماحول میں رہا جب تک
کبھی بھی یاروں کی جیبیں ٹٹولتا تو نہ تھا

تمام رشتوں کی عزت کا پاس تھا اس کو
پرائے بندِ قبا شب میں کھولتا تو نہ تھا

ہمارے شہر کے کلچر سے وہ تھا ناواقف
شراب پی کے سرِ راہ ڈولتا تو نہ تھا

ہوئے ہیں چار ہی دن اس کو منتخب ہو کر
وہ شخص پہلے کبھی جھوٹ بولتا تو نہ تھا

ناخدا کو کس زمانے میں خدا سمجھا تھا میں
شاعرِ مفلس سہی، اچھا بُرا سمجھا تھا میں

دولت کونین اپنی گردِ پا سمجھا تھا میں
آپ کیا سمجھے تھے جانے اور کیا سمجھا تھا میں

رندِ کہنہ وضعداری میں بھی دھوکا کھا گیا
ساقیا زلفوں کو ساون کی گھٹا سمجھا تھا میں

ایک ہی شئے ہے جو دو لفظوں میں بٹ کر رہ گئی
زندگی سے موت تک اِک فاصلہ سمجھا تھا میں

عشق کی منزل پہ خود میری وفا ہے شرمسار
باوفا نکلے ہیں جن کو بے وفا سمجھا تھا میں

آج دیکھا ہے تو آنکھوں کو یقیں ہوتا نہیں
آج تک حضرت ضیاؔ کو پارسا سمجھا تھا میں

خلائے دور کو تسخیر کر چکے ہوں گے
نئی صدی کے جیالے گزر چکے ہوں گے

بنامِ سازشِ خسرو خود اپنے تیشے سے
ہمارے شہر کے فرہاد مر چکے ہوں گے

وہ رہبرانِ زمانہ امامِ علم و ہنر
جو چاہیئے تھا نہ کرنا وہ کر چکے ہوں گے

تمام اہلِ زمانہ بہ خوفِ جنگ و جدل
خود اپنی موت کا سامان کر چکے ہونگے

نئے اُفق کی طرف تھی غزل رواں کچھ اور
جمالِ یار کے جلوے سنور چکے ہوں گے

ہمارے روز کے جھگڑوں سے تنگ آ کے ضیاؔ
زمیں پہ اہلِ زمانہ اتر چکے ہوں گے

جو جاگتے میں نظر آیا خواب جیسا تھا
تمام قوم کے سر پہ عذاب جیسا تھا

تڑپ تڑپ کے مرا ہے وہ روشنی کے لئے
سیاہ رات میں جو آفتاب جیسا تھا

خدا کے ملک میں یارو خدا کے بندے کا
جوازِ قتل بھی کارِ ثواب جیسا تھا

چمن تمام مہک اٹھا اس کی خوشبو سے
وہ نیک شخص خزاں میں گلاب جیسا تھا

فقیہہ ملک جو انصاف سے نظر کرتا
تو چاک دامنِ یوسف جواب جیسا تھا

شکوۂ اغیار ہے بوئے گل تازہ نہیں
نام ہے کس شئے کا خوشبو ان کو اندازہ نہیں

تیری ہر خوئے جفا پر انجمن خاموش ہے
کوئی شکوہ، کوئی طعنہ، کوئی آوازہ نہیں

میرے لب پر گر ہے شکوہ اس میں ہے شامل خلوص
میرے چہرے پر فریب و مکر کا غازہ نہیں

تیرے در سے جب ملے مجھ کو ملے جور و جفا
میرے جرم عاشقی کا کیا یہ خمیازہ نہیں

کاش یہ شئے ٹپ سکے پیمانہ ہائے وقت سے
آپ کو میری وفا کا کوئی اندازہ نہیں

ظلمتوں کے قلب تک کیسے بھلا پہنچے ضیاء
سب دریچے بند ہیں اور کوئی دروازہ نہیں

آجاؤ کہ دل دردبھرا ٹوٹ رہا ہے
آئینۂ احساس مرا ٹوٹ رہا ہے

اب اور نہ کھینچو مری اُمید کا دھاگا
تہذیب محبت کا سرا ٹوٹ رہا ہے

اے دخترِ شب رقصِ جنوں سازِ نفس سے
کیوں آج ترا جسم وفا ٹوٹ رہا ہے

حالات کی زد میں ہے ابھی آج کا انساں
کس واسطے آئین نیا ٹوٹ رہا ہے

آرام گیا، نیند گئی، صبر و سکوں بھی
کیا ہم پہ کوئی قہرِ خدا ٹوٹ رہا ہے

تم ہار گئے درد میں جھک جاؤ ضیاؔ اب
افسونِ شبِ ہجر و دعا ٹوٹ رہا ہے

چھپا رہا ہوں زمانے سے دولتِ قاروں
کوئی دکھانے کی شئے تو نہیں ہے سوزِ دروں

تغیرات کی کالی گھٹا اٹھی ہے مگر
حواسِ قوم پہ چھائے ہیں گیسوئے شب گوں

مفادِ ملتِ بیضا کی فکر کی یہ سبر
زباں پہ مہر ہے یہ بات میں کہوں نہ کہوں

کسی نے دور سے دعویٰ کیا "نہیں ہے کوئی"
کہیں قریب سے آواز آئی "میں بھی ہوں"

ابھی سلاسل و زنجیر میں مقیّد ہیں
تمہارے چاہنے والوں کا ہو جنوں افزوں

یہ آگہی جو ملی ہے تو روشنی نہ رہی
کہ حسن کچھ بھی نہیں ہے فقط نظر کا فسوں

زمیں کو اب بھی ضرورت ہے ابنِ آدم کی
ضیاء نہ چاند ستاروں پہ ماریئے شب خوں

پردوں میں فکر و فن کے رہی، جانِ فن کی یاد
جانِ بہار، جانِ جہاں جانِ من کی یاد

ہم مٹ گئے، حیات مٹی، درد مٹ گیا
اِک رہ گئی تو صرف تری انجمن کی یاد

مہکے ہوں پھول جیسے کہیں لاشعور میں
یوں آرہی ہے آج کسی گلبدن کی یاد

نکلی ہے آج قوسِ قزح آن بان سے
یا آسماں کو آئی ترے بانکپن کی یاد

ہر اک کلی جو چٹکی ہے فصلِ بہار میں
ہمراہ لائی ہے کسی غنچہ دہن کی یاد

جیتے ہیں اس اُمید پہ آئے گی ایک دن
اہلِ وطن کو ایک غریب الوطن کی یاد

موسیٰ ندی کے قرب میں رہتے ہو تم ضیاءؔ
غزلوں میں کیوں ہے وادیٔ گنگ و جمن کی یاد

دھوپ دی ہے تو سایہ باں بھی دے
جو ہیں بے گھر انہیں مکاں بھی دے

ساز کے ساتھ ساتھ دے کچھ سوز
آگ کے ساتھ کچھ دھواں بھی دے

دل کو دل کا مقام بھی سمجھا
اس کو اپنا کبھی نشاں بھی دے

تیرے دستِ عطا میں سب کچھ ہے
خار بخشے ہیں گلستاں بھی دے

سیر کر لوں ترے سمندر کی
میری کشتی کو بادباں بھی دے

زیبِ قرطاس ہو گیا ہے ضیاؔ
فکر دی ہے تو ترجماں بھی دے

تو شبِ ماہ میں اٹھ اٹھ کے بلکتا ہوگا
اور میری ہی طرح چاند کو تکتا ہوگا

رات کی رانی بھی تسکین نہ دیتی ہوگی
زخمِ یادوں کا سرِ شام مہکتا ہوگا

میری غزلیں ترے ہونٹوں پہ مچلتی ہوں گی
شاخِ گل پر کوئی بلبل جو چہکتا ہوگا

میں ہوں دوزخ میں مگر جنتِ آسایش کی
آتشِ گل سے ترا دل تو ~~سلگتا~~ (دہکتا) ہوگا

دیکھ کر چاند میں تصویرِ ضیاؔء دل تیرا
طفلِ ناداں کی طرح اب بھی ہمکتا ہوگا

وطن سے دور بہت دور قید خانہ ہے
چمن سے کنج قفس تک بڑا زمانہ ہے

دلوں میں اہلِ سیاست کے صرف حرص و ہوس
لبوں پہ عظمت و تقدیس کا ترانہ ہے

ہر ایک شاخ سے نسبت ہے آج بھی مجھ کو
جہاں جہاں ہے دھواں میرا آشیانہ ہے

ہمارے ظرف کی وسعت کہ پاس عہدِ وفا
فریب کھائے ہوئے ہیں فریب کھانا ہے

ہے ایک عمر سے ویران وقت کا مقتل
مری تلاش میں مدت ہوئی زمانہ ہے

جھنجھوڑتا ہے ضمیرِ عوام آج ضیاء
کہ زورِ بازوئے قاتل بھی آزمانا ہے

نظر زمانے کی نظروں میں ہم نے ڈالی تھی
شکست کھائی تھی پگڑی مگر بچالی تھی

ہر ایک بات ادھوری تھی تیرے ذکر بغیر
ہر ایک ذات ترے سامنے سوالی تھی

ستارے، چاند اترتے تھے میری گلیوں میں
مرے شباب میں ہر بات لاابالی تھی

جوان جذبوں نے ہاتھوں کی سخت محنت سے
خیال و خواب کی تعبیر خود نکالی ہے

تمہارے عشق میں ہم کو خراب ہونا تھا
وہ بات ہو کے رہی ہے جو ہونے والی تھی

مرا خیال تھا کچھ دیر رُک کے مِل بھی لوں
تمہارے شہر سے گذرا تو جیب خالی تھی

زہے نصیب ضیاء کی طرف بھی دور آیا
یہ اور بات ہے کہ ٹوٹی ہوئی پیالی تھی

قرب کی آگ کو دہکاؤ، بڑی سردی ہے
اور نزدیک ذرا آؤ بڑی سردی ہے

فاصلے نشترِ احساس کو ٹھنڈک دیں گے
میری باہوں میں سمٹ جاؤ بڑی سردی ہے

برف ہی برف ہے جس سمت نظر جاتی ہے
پیار کی دھوپ میں آجاؤ بڑی سردی ہے

برف کے پھول چناروں سے گلے ملتے ہیں
آج موسم کی قسم کھاؤ، بڑی سردی ہے

دیکھ لو بہتا ہوا چشمہ بھی تخ بستہ ہے
تم مجھے چھوڑ کے مت جاؤ بڑی سردی ہے

دو بدن ایک ہی کمبل میں گزر کریں گے
وقت کہتا ہے نہ شرماؤ، بڑی سردی ہے

طفلِ ناداں ہے ضیاء کوئی کھلونا دے دو
شمعِ اُمید سے بہلاؤ بڑی سردی ہے

ایک ہی رت تھی مگر تجھ کو جدا دیتی گئی
آپ کو خوشبو مجھے زنجیر پا دیتی گئی

یادِ جاناں کی طبیعت کس قدر خوش ذوق تھی
موسمِ گل کی مجھے ٹھنڈی ہوا دیتی گئی

گردشِ دوراں نے سمجھا ہے مجھے میں نے اُسے
میں جدھر بڑھتا گیا وہ راستہ دیتی گئی

تیری آشفتہ مزاجی دوررس نکتہ شناس
آنے والے موسموں کا تجزیہ دیتی گئی

وہ جماعت کم تھی کیا لیتی کسی سے انتقام
زخم کھا کر دستِ قاتل کو دُعا دیتی گئی

نوجوانی موسمِ گُل میں کِھلا کر گُل نئے
جھیل سی شفاف آنکھوں کو حیا دیتی گئی

میری آوارہ مزاجی سُرخرو ہو کر ضیاؔ
نقرئی ہاتھوں کی زینت کو حِنا دیتی گئی

میں ریزہ ریزہ ہوں سینے سے مت لگاؤ مجھے
میں خوابِ شب ہوں یہ بہتر ہے بھول جاؤ مجھے

میں انگلیوں میں چبھوں گا، لہو رلاؤں گا
بکھر چکا ہوں سرِ راہ مت اُٹھاؤ مجھے

نیازِ خاک کو صد نازِ آسماں نہ کرو
میں نقشِ پا ہوں نہ سجدوں سے تم اٹھاؤ مجھے

ابھی اُمید کی کونپل نے آنکھ کھولی ہے
میں نخلِ سبز ہوں مت آگ سے جلاؤ مجھے

غریب ماں کی دعا ہوں چراغِ شام ہوں میں
میں جانشین ہوں سورج کا مت بجھاؤ مجھے

ہم لوگ اب بھی کوہِ ندا کے سفر میں ہیں
لیکن سمجھ رہے ہیں کہ اپنے ہی گھر میں ہیں

موت و حیات دونوں کے لب پر ہے الاماں
ایسے بھی معجزے مرے زیر و زبر میں ہیں

اے اہلِ کاروانِ ادب جاگتے رہو
اب بھی سفید پوش اسی رہگزر میں ہیں

دیکھو تو مثلِ سنگ ہیں پرکھو تو مثلِ لعل
ایسے نوادرات بھی میری نظر میں ہیں

کچھ یار آستینوں میں خنجر لئے ضیاء
سنتے ہیں ایک مردِ خدا کی خبر میں ہیں

دینے لگے ہیں یار دغا جاگتے رہو
اے ساکنانِ شہرِ وفا جاگتے رہو

اے پاسبانِ حرمتِ امن و اماں اٹھو
بڑھنے لگے ہیں دستِ جفا جاگتے رہو

جسکی پلک تو جان لو صدیاں گزر گیئں
دی ہے نئی سحر نے صدا جاگتے رہو

تدبیر کے چراغ جلاؤ کہ رات ہے
تقدیر ہو نہ جائے خفا جاگتے رہو

بندوں کے واسطے بڑا نازک مقام ہے
سنتے ہیں سو رہا ہے خدا جاگتے رہو

آواز دے رہے ہیں اندھیرے قریب سے
سورج بھی سو گیا ہے ضیاؔ جاگتے رہو

تشنگی کو بھول کر ہم جام کی باتیں کریں
صبح کی مانگیں دعائیں شام کی باتیں کریں

چاند مرجھانے لگا اور چاندنی سونے لگی
رات بیتی جائے ہے کچھ کام کی باتیں کریں

ہجر کے لمحے تھکے ماندے بہت بوجھل اداس
عاشقو آؤ! گل و گلفام کی باتیں کریں

آنے والی نسل اس سے کچھ تو عبرت پائے گی
ہم دلِ برباد کی بدنام کی باتیں کریں

میکدوں میں، بتکدوں میں، زندگی کاٹی ضیاءؔ
ہے درِ توبہ کھلا اسلام کی باتیں کریں

پینے کے لئے ہیں نہ پلانے کے لئے ہیں
یہ ساغر تو صرف دکھانے کے لئے ہیں

ہم وقت کو آئینہ دکھاتے کے لئے ہیں
تہذیب کا معیار بڑھانے کے لئے ہیں

الفاظ جو نشتر کی طرح اترے ہیں دل میں
یہ زخم پہ مرہم بھی لگانے کے لئے ہیں

اب یہ بھی مناسب نہیں پر آنکھ نہ نم ہو
کچھ اشک فقط آگ لگانے کے لئے ہیں

یہ موج ہوا، نکہت گل، نغمۂ بلبل
عنوان یہ سارے ترے آنے کے لئے ہیں

بن باس تو دنیا کو دکھاتے کے لئے ہے
تیاریاں راون کو مٹانے کے لئے ہیں

تن کو کسی زنجیر کا پابند نہیں ہے
فن کار ضیاؔ سارے زمانے کے لئے ہیں

تختِ فلک سے جب مہِ خوش رُو اُتر گیا
لیلائے شب کا پرچمِ گیسو اُتر گیا

تہذیب کے حسین مراسم کی آڑ میں
گُل پیرہن کا خلعتِ خوشبو اُتر گیا

دل ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل کہاں گئی
دو دن میں سر سے پیار کا جادو اُتر گیا

بھولی ہوئی جو بات کوئی یاد آ گئی
شیشے میں کوئی قیمتی آنسو اُتر گیا

مجھ کو تری تلاش میں اپنا پتہ ملا
یہ کیا ہوا! نقابِ من و تو اُتر گیا

مے اور بھی گلاب کی رنگت میں ڈھل گئی
ساغر میں عکسِ ساقیٔ گلرو اُتر گیا

صدیوں سے تشنہ لب تھا ضیاؔ نیند آ گئی
دل دِل کی جستجو میں، لبِ جو اُتر گیا

بجھتے ہوئے شعلوں کو ہوا ہم نے ہی دی ہے
اس دل کو تڑپنے کی سزا ہم نے ہی دی ہے

عریاں جو بدن تھے انہیں ملبوس دیا ہے
تہذیب و تمدن کی ردا ہم نے ہی دی ہے

شامل ہے ہمارا بھی لہو رنگِ چمن میں
کلیوں کو تبسم کی ادا ہم نے ہی دی ہے

کوہسار و بیاباں میں اڑائے ترے پرچم
دریاؤں کے سینے پہ ندا ہم نے ہی دی ہے

ہر فن کو نیا موڑ نیا حسن دیا ہے
ہر فکر کو کاغذ کی قبا ہم نے ہی دی ہے

اے دورِ پر آشوب ذرا مڑ کے نظر کر
ترکے میں تجھے رسمِ وفا ہم نے ہی دی ہے

ہر سنگ کو حکمت کا سبق ہم نے پڑھایا
ہر رنگ کو کھلنے کی ضیا ہم نے ہی دی ہے

آگ پانی میں لگا کر دیکھیں
اُس کو آئینہ دِکھا کر دیکھیں

نخلِ تدبیر بھی کھائیں مِل کر
شجرِ اُمّید ہلا کر دیکھیں

فرد سے قوم کا رشتہ کیا ہے
ہم بھی تاریخ اٹھا کر دیکھیں

نظمِ مے خانے کی بنیاد ہے کیا
رند ساقی کو پِلا کر دیکھیں

ذوقِ تزئین! رہِ صبحِ وصال
ہجر کی شام سجا کر دیکھیں

پھول ہے خار ہے یا انساں ہے
اُس کو سینے سے لگا کر دیکھیں

ضد ہے اربابِ سیاست کی ضیاءؔ
شہر کا شہر جلا کر دیکھیں

تجھے آواز دوں کیسے یہاں سے
بہارِ گمشدہ لاؤں کہاں سے

مرے تن امن میں کانٹے چبھ رہے ہیں
کہوں جانِ بہاراں کس زباں سے

اُجالا بھیک میں اب مانگتے ہو
چراغاں تھا چراغِ آشیاں سے

جوانی کتنی سادہ لوح نکلی
ستارے توڑ لائی کہکشاں سے

اُبھر آیا اُسی نسبت سے وہ بھی
جبیں اُٹھی جو سنگِ آستاں سے

پہنچ ہے میرے سجدوں کی مکاں تک
مکیں تکلیف کر اب لامکاں سے

حاکمِ وقت نے مجمع میں سزائیں دی ہیں
ہم نے ہر حال میں خلقت کو دعائیں دی ہیں

غنچہ و گل نے اشاروں میں شکایت کی ہے
فصلِ گل تو نے ہمیں چاک قبائیں دی ہیں

تم بھی تاریخ کے صفحات اُلٹ کر دیکھو
کس نے بدلے میں جفاؤں کے وفائیں دی ہیں

انقلابات نے ظالم کو بنایا منصف
اور مظلوم کو دُروں کی سزائیں دی ہیں

اُس سفینے کے مقدّر کا خدا حافظ ہے
جس کو طوفان نے ساحل سے صدائیں دی ہیں

بھیک میں دادِ سخن تو بھی ضیاءؔ پائے گا
تو نے غزلوں کو ترنم کی سزائیں دی ہیں

تمام عمر جو کانٹوں کے آس پاس رہے
ترے نصیب گلوں سے بھی روشناس رہے

بنامِ گردشِ دوراں ترے دیئے ہوئے غم
کبھی جدا بھی ہوئے ہیں تو آس پاس رہے

ترے مزاج کو نسبت ہے موسمِ گل سے
ترے طفیل میں ہم سے بھی خوش لباس رہے

کسی بدن میں رچا ہے مری غزل کا جمال
مری غزل میں کسی گلبدن کی باس رہے

اپنی پلکوں پہ کوئی خواب سجائے رکھئے
اپنے خاکوں میں کوئی تاج بنائے رکھئے

عین ممکن ہے، بہاروں کا گزر ہو جائے
خانۂ دل کے در و بام سجائے رکھئے

کامیابی تو بڑی رات گئے آتی ہے
من کے آنگن میں کوئی دیپ جلائے رکھئے

آپ کے پاس شرافت کا اگر جوہر ہے
اس زمانے کی نگاہوں سے بچائے رکھئے

زندگی جن کی لطافت سے عبارت ہے ضیاؔء
ایسی یادوں کو کلیجے سے لگائے رکھئے

شامل جو ایک عمر مرے بھائیوں میں تھا
جب گھر مرا جلا تھا، وہ بلوائیوں میں تھا

تاریخ میں کہاں ہے مرا نام دیکھنا
میں بھی تمھارے حسن کے شیدائیوں میں تھا

کچھ میرا عشق بھی مجھے بدنام کر گیا
کچھ تیرا حسن بھی مری رسوائیوں میں تھا

اس سرد ملک میں وہ مزہ کس طرح ملے
وہ لطف جو کہ گاؤں کی پروائیوں میں تھا

اس تیز و تلخ لے میں دلِ مضطرب نہ ڈھونڈ
امرت جو اپنے دیس کی شہنائیوں میں تھا

ترکِ تعلقات کی افواہ اڑ گئی
ذہنِ رقیب حاشیہ آرائیوں میں تھا

کڑوے کسیلے سے تھے بول تھے لہجہ تھا کھردرا
شامل مگر خلوص بھی گہرائیوں میں تھا

منزل بنام راہگزر کون دے گیا
بے سمت راستوں کا سفر کون دے گیا

موسم بدل گیا ہے ترے انتظار میں
پھولوں کو میرے غم کی خبر کون دے گیا

آن شوخ انکھڑیوں میں حیا کھیلنے لگی
جلووں کو احتیاطِ نظر کون دے گیا

مجبور نے سلاسل و زنجیر توڑ دیں
مظلوم کی دعا میں اثر کون دے گیا

ہر غم شناس آنکھ شناسا لگی ضیاء
گلہائے نور داغِ جگر کون دے گیا

کوئی اُشیلا، کوئی روزی، کوئی زہرہ دیکھوں
جی میں آتا ہے کوئی خواب سنہرا دیکھوں

حکم دے دوں گا قلم کو کہ وہ موتی لکھے
کوئی آنسو تری پلکوں پہ جو ٹھہرا دیکھوں

تازیانہ سا ہے طوفاں مری فطرت کے لئے
یہ سمندر ہے کہاں اور بھی گہرا دیکھوں

آہِ مظلوم سے ہلتا تھا کسی دور میں عرش
آج میں ارض و سماوات کو بہرا دیکھوں

لاکھ بکھرا سہی ہر حال میں سچ کہتا ہے
کیوں نہ ٹوٹے ہوئے آئینے میں چہرہ دیکھوں

جن کی آنکھوں میں تھے شعلے سے بغاوت کے ضیاءؔ
اُن کے ہونٹوں پہ روایات کا پہرا دیکھوں

وار بھاری تھا مگر ہلکا لگا
دستِ خنجر بھی مجھے اپنا لگا

خودکشی کر لی کسی گمراہ نے
زندگی کے نام پر دھبّہ لگا

اس کا گھر ہے گاؤں سے بالکل الگ
شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ لگا

اس ہوا میں زہر کیسے آگیا
شہر میں چلتے ہوئے دھڑکا لگا

میں نے سیرابی کی لذت پائی ہے
اے ندی! تجھ کو بتا کیسا لگا

کچھ نہ کچھ قیمت تو دینی تھی ضرور
وہ فتح پاکر شکستہ پا لگا

اس قدر تنہا نہ دیکھا تھا کبھی
تیرا بندہ آج تجھ جیسا لگا

میں چراغِ رہگزر ہوں میں ہوا میں جل رہا ہوں
میں کسی غریب ماں کی سرِ شام کی دُعا ہوں

نہ ترنّمِ بہاراں ، نہ ترانۂ شبستاں
میں شکستہ سازِ دل کی کوئی دُکھ بھری صدا ہوں

کسی نورتن سے رشتہ ، نہ محل سے کوئی نسبت
جہاں کھائی میں نے ٹھوکر وہیں اُٹھ کھڑا ہوا ہوں

مِری خاکِ نقشِ پا کی ابھی منتظر ہے منزل
جسے رہگزر نے ڈھونڈا ، میں وہی شکستہ پا ہوں

شبِ ہجر و غم کے مارو ، مرا تذکرہ ادب سے
نئے دور کا ادب ہوں ، نئی صبح کی ضیا ہوں

زندگی کے باغی کو پھر امان دے دی ہے
مصلحت کی چوکھٹ پر دل نے جان دے دی ہے

ہم سیاہ فاموں کو بے زبان کشتوں کو
دور کے مصائب نے خود زبان دے دی ہے

ذکر قامت و قد کا اُن کے رُوبرو کر کے
طالبات کالج کو ہم نے شان دے دی ہے

جوہر شرافت نے اور حیا کے زیور نے
اِک غریب لڑکی کو آن بان دے دی ہے

ہنستے ہنستے ہولے سے تیر دل پہ پھینکے گا
اُس شریر بچے کو کیوں کمان دے دی ہے

وقت کے پروں اُڑ کر چاند پر ضیاء پہنچے
وحشتِ نارسائی میں، ہوا اڑان دے دی ہے

کربلا ڈھونڈتی پھرتی ہے نکل میرے دوست
چھوڑ کر شہرِ وفا دشت میں چل میرے دوست

ہم غریبوں کے سدا ہاتھ کٹے جیب کٹیں!
زندگی بیچ گئی تاج محل میرے دوست

یہ جو نادار ہیں مفلس ہیں مرے اپنے ہیں
کاش کیچڑ میں کھلے کوئی کنول میرے دوست

جو ہے قاتل وہی منصف ہے کہاں کا انصاف
واسطے اپنے یہاں آج نہ کل میرے دوست

میٹھی باتوں کے عوض عقل کو گروی مت رکھ
راہزن لیتے ہیں اب بھیس بدل میرے دوست

وقت نکلا ہے کہ مردوں میں مسیحا ڈھونڈے
اے ضیاء چھیڑ کوئی تازہ غزل میرے دوست

ماضی گزر چکا ہے اب روئے حال دیکھوں
بیتی ہے شامِ ہجراں صبحِ وصال دیکھوں

ایسی گھڑی بھی آئے اے مہر و ماہِ الفت
تو لا جواب نکلے میں بے سوال دیکھوں

شہرِ قلیؑ میں یارب ایسی بہار آئے
صد ماہ و سال دیکھیں صد ماہ و سال دیکھوں

خونِ جگر کی یارب فن کو کمی نہ دینا
ایسا سرور دے دے جو لازوال دیکھوں

بے ننگ و نام ہو کر آیا ہوں تیرے در پر
میں بے کمال ہو کر تیرا کمال دیکھوں

ع ۱ قلی قطب شاہ

چند لمحوں کے شناخسانے میں
عمر گزری تجھے بھلانے میں

کس مسیحا کا ذکر چھیڑا ہے
جان سی پڑ گئی فسانے میں

لوگ رفتار اپنی بھول گئے
زندگی سے قدم ملانے میں

اُس سے باہر ملے وہ ناصح تھے
آدمی تھے شراب خانے میں

رات کی دسترس پہ طنز بھی ہے
ایک غنچے کے مسکرانے میں

ہم نے بیدل سے مات کھائی ہے
ہم بھی ہیرو تھے اِک زمانے میں

کر نہ مجبوریوں کا ذکر ضیاء
سب ہیں مجبور اس زمانے میں

زندگی کے نقیب ہیں ہم لوگ
عاشقانِ صلیب ہیں ہم لوگ

باغباں کے حبیب ہیں ہم لوگ
فطرتاً عندلیب ہیں ہم لوگ

بعد مرنے کے یاد آتے ہیں
کس قدر خوش نصیب ہیں ہم لوگ

ہر زمانے میں دہر بیتے ہیں
ہر صدی کے طبیب ہیں ہم لوگ

عرش کے پار ہے مکاں اپنا
ہر وطن میں غریب ہیں ہم لوگ

ہم پہ پتھراؤ دور دور سے ہے
ہر طرف سے قریب ہیں ہم لوگ

گو ترستے ہیں روشنی کے لئے
ظلمتوں کا نصیب ہیں ہم لوگ

میرے وجود پہ اک سائباں سا لگتا ہے
وہ آدمی ہے مگر آسماں سا لگتا ہے

جو جانتا ہی نہیں فکر کیا ہے فن کیا ہے
وہ ناشناسِ سخن قدرداں سا لگتا ہے

ہجومِ یاس میں بھی مسکرا کے ملتا ہے
وہ زخم زخم سہی گلستاں سا لگتا ہے

وہ بولتا ہے نگاہوں سے اس قدر اردو
خموش رہ کے بھی اہلِ زباں سا لگتا ہے

جہاں پہ دام نہ دانہ ہے، صرف تنکے ہیں
کسی کا پیار مجھے آشیاں سا لگتا ہے

یہ غیر ملک بھی احساس کے جھروکوں سے
کبھی کبھی مجھے ہندوستاں سا لگتا ہے

مری کم آگہی کہیں نہ گئی
شدتِ تشنگی کہیں نہ گئی

زخم پر پھر نمک چھڑکتے ہیں
اُن کی چارہ گری کہیں نہ گئی

لاکھ تہذیب نے سنوار دیا
حسن کی سادگی کہیں نہ گئی

وقت کی بے رُخی نے کوشش کی
میری زندہ دلی کہیں نہ گئی

جتنی راتوں ضیاء رہا زندہ
ہجر کی شب کبھی کہیں نہ گئی

دولتِ کائنات بھی کم ہے
کس قدر قیمتی ترا غم ہے

کون آنسو ہمارے پونچھے گا
آنکھ جو بھی ملے ہے پُرنم ہے

میکدوں نے نظر چرائی ہے
میری آنکھوں میں کون سا غم ہے

روشنی روشنی کی رسوائی
زندگی زندگی کا ماتم ہے

جام و مینا کی خیر ہو ساقی
تشنگی کا مزاج برہم ہے

ہے سحر کا مجھے یقیں لیکن
رات لمبی ہے زندگی کم ہے

شمع آرزو ہے بجھنے کو
چاند تاروں میں بھی ضیا کم ہے

لاکھ بدلا بھیس لیکن صاف پہچانے گئے
رند بن کر شیخ صاحب گرچہ میخانے گئے

دیکھ کر مجھ کو مصیبت میں کنارہ کر گئے
شکریہ اے دوست تیرا یار پہچانے گئے

منزلِ سود و زیاں پر رُک گئے اہلِ خرد
بے خطر، بے خوف تجھ تک تیرے دیوانے گئے

دیر تک دیر و حرم میں جانے کیا باتیں ہوئیں
دور تک دل کے تعاقب میں صنم خانے گئے

پارساؤ! دیکھ لو کیسا زمانہ آگیا
خود جو ہیں بھٹکے ہوئے اوروں کو سمجھانے گئے

بے قرارو بہار کے دن آئے
مے گسارو بہار کے دن آئے

ٹکڑے ٹکڑے بکھر رہا ہے چاند
ماہ پارو بہار کے دن آئے

عارض و لب پہ آگ دہکے گی
گلعذارو بہار کے دن آئے

شاخساروں میں کہکشاں الجھی
چاند تارو بہار کے دن آئے

غم کے مارو اٹھاؤ جام و سبو
غم کو مارو بہار کے دن آئے

صندلی جسم سے اڑی خوشبو
پیار! پیارو بہار کے دن آئے

آبلہ پا ضیاءؔ بھی آئے گا
خارزارو بہار کے دن آئے

نہ دیکھ عالمِ حرماں و یاس ہے کتنا
مقام یہ کسی ہمت کو راس ہے کتنا

کہیں جنون کی وحشت کہے نہ قاتل سے
ترے بدن پہ وفا کا لباس ہے کتنا

فسانہ کہنے کا الزام دوسروں پہ نہ رکھ
ترا مزاج حقیقت شناس ہے کتنا

سوال کرنے سے پہلے ذرا نظر بھی کر
جواب دامنِ یوسف کے پاس ہے کتنا

ضیاءؔ! یہ کیا ہے کہ اک سرپھرے کے قتل کے بعد
فقیہہِ ملک کا چہرہ اداس ہے کتنا

زخموں کو سلیقے سے سجا کیوں نہیں لیتے
ٹوٹے ہوئے شیشوں کی دعا کیوں نہیں لیتے

الفاظ کی سنگین عمارت سے نکل کر
انکار کی کچھ تازہ ہوا کیوں نہیں لیتے

تکلیف تو آنے کی کنواں کر نہ سکے گا
گر پیاس لگی ہے تو بجھا کیوں نہیں لیتے

آنکھوں میں نمی دیکھ کر سب لوگ ہنسیں گے
تکلیف تبسّم میں چھپا کیوں نہیں لیتے

مانگے کا اجالا تو نہیں قرض اٹھاؤ
مہتاب ہو سورج کی ضیاء کیوں نہیں لیتے

جب کبھی مہکی چنبیلی، تیری یاد آئی بہت
پھر کسک ہونے لگی چلتی ہے پروائی بہت

آم کی ڈالی پہ کوئل کوکتی ہے بار بار
کاٹنے کو دوڑتی ہے مجھ کو تنہائی بہت

اب مریضِ عشق بن کر ہو گیا میرا رقیب
چارہ گر کو تھا کبھی زعمِ مسیحائی بہت

فصلِ گل بدلی کہ بدلا ہے مزاجِ عندلیب
نیم کی ڈالی پہ اس نے راگنی گائی بہت

چودھویں شب میں ضیاؔ سویا نہیں مدت ہوئی
کوئی وعدہ یاد آیا، نیند گو آئی بہت

پر شکستہ ہے زیرِ دام ہے وہ
اور سمجھتا ہے تیز گام ہے وہ

چھپ ہی جائے گا وہ کہیں نہ کہیں
غیر شائع شدہ کلام ہے وہ

رہزنوں سے بھی ہے علیک سلیک
رہبروں میں بھی نیک نام ہے وہ

وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہے
واہ کتنا سبک خرام ہے وہ

چڑھتے سورج سے جھک کے ملتا ہے
فطرتاً وقت کا غلام ہے وہ

رند کے لب دیکھ تشنہ کام سے
آتشِ سیّال چھلکی جام سے

داستانِ دل کہاں سے چھیڑتا
آپ آئے تھے کسی کے کام سے

چاہنے والو! بڑی نزدیک ہوں
صبح نے آواز دی ہے شام سے

عشق جا پہنچا فرازِ دار تک
حسن چھلکا تھا فرازِ بام سے

میں ضیاء ہوں، روشنی ہوں، نور ہوں
تیرگی جلتی ہے میرے نام سے

تھی بحث ہر زباں پہ دوام و ثبات کی
لٹنے کی راہِ عشق میں ہم نے ہی بات کی

دیتے نہیں ہیں سانس کی فرصت بھی شش جہت
مسموم کس قدر ہے فضا کائنات کی

مشاطگی دہر میں ہم خود بگڑ گئے
آرائشوں نے لوٹ لی رونق حیات کی

برہم ہیں نسل و قوم و سیاست کے پیشوا
انسانیت کے دکھ کی ضیاء تھے جو بات کی

خلوتوں میں انجمن آرائیاں
یاد ہیں ان کی کرم فرمائیاں

قطرۂ خوں کی فلک تک دسترس
ایک مشتِ خاک کی گہرائیاں

کچھ فرشتے ہاتھ ملتے رہ گئے
کِس نے لی توبہ شکن انگڑائیاں

حسن کو اِک شرم دامن گیر ہے
عشق کے دامن میں صد رسوائیاں

لڑکھڑا کر رہ گئے دیر و حرم
میکدوں نے جب بھی لی انگڑائیاں

تیرے جلووں سے انہیں نسبت کہاں
چاند سورج ہیں تری پرچھائیاں

نام سے کِس نے ضیاؔ آواز دی
بج اٹھی ہیں چار سو شہنائیاں

قطعات

فرش سے عرش تک قیامت تھی
جسمِ فانی کی تھی شبِ معراج
ساقیا تیری دلنشیں ہستی
چاند تاروں سے لے رہی تھی خراج

—— ٥٥٥ ——

شانِ قدرت عجیب بات رہی
اک معمّہ یہ کائنات رہی
موت کو جب قریب سے دیکھا
سر بسر چشمۂ حیات رہی

—— ٥ ——

گنگناؤ کہ مسکرائے سحر
مسکراؤ کہ پھول کھل جائیں
اور دل کے قریب آجاؤ
آسمان و زمین مل جائیں

~~ایسی~~ شمع ایسی جلائی ہے شب میں
جو ستاروں کو نور دیتا ہے
صبح دم اپنی لو کے سورج سے
زندگی کو شعور دیتی ہے

—— ○ ——

یہ چنبیلی کا ایک پودا ہے
جس کے سائے میں ناگ بستے ہیں
زندگی اس قدر حسین نہیں
جس قدر ہم اسے سمجھتے ہیں

—— ○ ——

کان ہوتے ہوئے بھی بہرا ہے
صرف حرص و ہوس کا بندہ ہے
جیب سے دل خرید نے والا
آنکھ رکھتے ہوئے بھی اندھا ہے

○

گالوں پہ شفق دمک رہی ہے
یا صبح سے شام مل رہے ہیں
زلفوں میں ہے رات کا بسیرا
چہرے پہ گلاب کھل رہے ہیں

میرے محبوب یہ جبیں خم ہے
تو نے اپنا بنا لیا مجھ کو
عقل حیران تھی کہ کیا مانگے
دل نے بن مانگے پالیا تجھ کو

اپنی مرضی سے فیصلہ ہو جائے
اور پل بھر میں رونما ہو جائے
جب بھی انسان مانگتا ہے وفا
چاہتا ہے کہ معجزہ ہو جائے

○

چشمِ مجنوں سے دیکھئے لیلیٰ
جیسے مرنا ہے اُس پہ مرتا ہوں
حور سب شیخ کو مُبارک میں
ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں

آبشاروں کے گیت شرمائیں
اس قدر چست بر محل نہ کہو
لوگ چلمن سے لگ کے جھانکیں گے
اتنی نکھری ہوئی غزل نہ کہو

اس نے ہر گام آزمایا ہے
روز و شب حادثوں سے کھیلا ہوں
والدہ کی دُعا تھی میرے ساتھ
وقت سمجھا کہ میں اکیلا ہوں

زخمِ تاریخ کے سی لیتے ہیں
مے نہیں اشک ہی پی لیتے ہیں
محتسب جام شکستہ مت پھینک
ہم انھیں دیکھ کے جی لیتے ہیں

جو جام آیا ہے حصّے میں شغلِ جام بھی کر
جو تشنہ لب ہیں مگر اُن کا احترام بھی کر
ملی ہے کرسی تو شکرِ خدا پھر اس کے بعد
ہمیں نے ووٹ دیئے ہیں ہمیں سلام بھی کر

میرا کلام اپنے کرم سے سنوارنا
میری غزل کو حُسنِ ازل سے نکھارنا
میری دُعا ہے بعد درود و سلام کے
تھوڑا سا آسمان زمیں پر اتارنا

○

مانگنے سے تو مل نہیں سکتیں
یہ ضروری ہے آپ بھی کچھ دیں
وقت خوشیوں کا ایک تاجر ہے
آپ قیمت ادا کریں لے لیں

دیکھ کر تیری مست نظروں کو
جام و ساغر چھلک گئے ہوتے
میں تو پھر رندِ لا ابالی ہوں
شیخ و ناصح بہک گئے ہوتے

ہر دو عالم ہیں جلوہ گاہِ جمیل
شعلۂ حسن پھر جواں ہو گا
میری نظروں کی آزمائش ہے
یا فرشتوں کا امتحاں ہو گا

رحمتِ حق کی آبیاری میں
وقتِ صبح نزول بیٹھا ہوں
جب بھی تیرے قریب آیا ہوں
اپنی ہستی کو بھول بیٹھا ہوں

— ० —

خالقِ کائنات میرے سوا
سر میں موسیٰ کے بھی یہ سودا تھا
وہ حجابات کی تلاش میں تھے
اور تو سامنے ہویدا تھا

— ० —

دردِ دل کی دوا نہ ہو جائے
وصل سے آشنا نہ ہو جاؤں
اتنے نزدیک جا رہا ہوں میں
قرب سے ہی فنا نہ ہو جاؤں

قومی یکجہتی

چار مینار

(انتساب: حیدرآباد کے دو عظیم شاعروں کے نام جن کے اسمائے گرامی ہیں
جہاندار افسر اور اسماعیل ظریف)

چار مینار بڑا پیارا ہے، چار مینار بہت اونچا ہے
بونا و پستہ قد، دل میں نفرت کے الاؤ لے کر
اس کو دیکھیں گے حقارت سے اگر
ٹوپیاں خاک پہ گر جائیں گی، چار مینار بہت اونچا ہے
یہ علامت ہے جناب، قومی یکجہتی کی

یہ قلی شاہ کی الفت کا پتہ دیتا ہے، مادرِ ہند کی عظمت کا پتہ دیتا ہے
گاندھی و نہرو کی رفعت کا پتہ دیتا ہے، حیدرآباد کی جنت کا پتہ دیتا ہے
چار مینار بہت اونچا ہے، چاند پر مت تھوکو

چار مینار فقط ایک عمارت ہی نہیں، ایک تہذیب، ایک تاریخ بھی ہے
اس میں شاہوں کی روایات بھی ہیں اس میں پوشیدہ طلسمات بھی ہیں

اس میں ولیوں کی کرامات بھی ہیں، اس میں انسانوں کے جذبات بھی ہیں
اس کے مینار گراؤ گے تو دب جاؤ گے، اس کی بنیاد مٹاؤ گے تو مٹ جاؤ گے
چار مینار بہت پختہ ہے، یہ علامت ہے جناب قومی یکجہتی کی
اس سے سرمت ٹکراؤ، سر جو پھوٹے گا شکایت ہوگی

چار مینار فقط بے کس و بے بس ہی نہیں، چار مینار کے پاس
کان ہیں، آنکھ ہیں اور ہاتھ بھی ہیں
چار مینار ہے خوابیدہ ابھی، نیند سے جب یہ کبھی جاگے گا
زلزلہ آئے گا، نفرت و ظلم سے کچلے ہوئے مجبور عوام
قصر و ایواں سے جو پوچھیں گے حساب، انقلاب آئے گا
حیدرآباد کی تہذیب گلِ آتش ہے، دیرت گلچیں سے کہو
اس طرف ہاتھ بڑھائے گا تو جل جائے گا

چار مینار کا پیغام ہے کیا؟ تیشۂ وقت کی ضرب
دستِ آذر کی قسم، جس نے ڈھالے ہیں زمانے میں صنم
سنگِ مرمر کے تراشیدہ خواب، مادیت کے سراب
اس سیہ خانے سے، ایک سورج بھی کبھی نکلے گا
اک براہیم بھی پیدا ہوگا
چار مینار بہت اونچا ہے

خوابِ فرعون

ایشیاء کے باشندے
تو نے سر اٹھانے کی گستاخی کیوں کی
کیا تو بھول گیا
کہ اس غلطی کی سزا تیرے آباو اجداد
کو کیا دی گئی تھی
تو نے آسمان کی طرف کیوں دیکھا
تو زمین کی طرف دیکھ
تو صرف سر جھکانے کے لئے پیدا ہوا ہے
تجھے دیکھ کر دوسرے خربوزے بھی
رنگ بدلیں گے
اس لئے تجھے سزا دینی ضروری ہے
تاکہ تیری قوم
سبق حاصل کر سکے

اور تیری آنے والی نسلیں
صرف ہماری سماجی، سیاسی، معاشی
اور ذہنی غلامی کے لئے جنم لیں

ایشیاء کے فرزندو

پھول کا تبسم ہی
زندگی کا پرتو ہے
پھول توڑنا آساں
اک کلی کے کھلنے تک
مہر و ماہ زمیں رل کر
خون و دل جگر دے کر
وقت صرف کرتے ہیں
لاکھ کاوشیں آخر
پھول بن کے کھلتی ہیں

عشق کی تمنّا ہے
حسن کا ارادہ ہے
عقل کا نتیجہ ہے
وقت کا تقاضہ ہے

مت سنو مری اپنے
دل کی بات تو مانو
ایشیاء کے فرزندو
کاش تم بھی پہچانو

روشنی بڑی شئے ہے
دوستی بڑی شئے ہے
امن کی فضاؤں میں
زندگی بڑی شئے ہے

سوال

میں کھلاؤں گا شگوفے ہر روز
خوشہ چینی ہے تمہاری فطرت
میں جلاؤں گا سدا فہم و فراست کے چراغ
تم بجھاتے رہنا
کس نے روکا ہے تمہیں

لیکن اس بات کا ہے مجھ کو یقیں
آنے والی جو نئی نسل ہے، پوچھے گی ضرور
"تم نے اُن ہاتھوں سے جو
دستِ گلچیں کی حمایت میں اُٹھے
اور چراغوں کے بجھانے کو بڑھے
کیوں تعاون کیا، کیوں دوستی کی؟"

تلاش

محفلوں میں تو کامیاب ملے
خلوتوں میں بھی باریاب ملے

ہم نے ڈھالا انہیں حقیقت میں
زندگی تجھ سے جتنے خواب ملے

چند کانٹے ملے تو کیا غم ہے
زندگی بھر ہمیں گلاب ملے

اس سے پہلے کہ ہم سوال کریں
پتھروں سے ہمیں جواب ملے

ہم جو ذرّوں کو ڈھونڈنے نکلے
راہ در راہ آفتاب ملے

غم سدا گردِ کارواں ہی رہا
ہم مسرّت کے ہمرکاب ملے

چاندنی کی کبھی جو خواہش کی
ہر در و بام ماہتاب ملے

چشم ساقی کا ہے ضیاؔ یہ کرم
کس کو حسرت ہے اب شراب ملے

اے مرے گاؤں

اے مرے گاؤں ترا چاہنے والا میں ہوں
دے دیا سب نے جسے دیس نکالا میں ہوں

ماں نے آداب سکھائے ہیں مجھے جینے کے
دربدر ٹھوکریں کھا کر جسے پالا میں ہوں

میں وہ درد، جو فاقوں سے اٹھا کرتا ہے
گو تہی دست سہی، عزم ہمالہ، میں ہوں

قوم کے جسم میں مانند کسان و مزدور
خون بن بن کے سدا دوڑنے والا میں ہوں

مثل کانٹے کے کھٹکتا ہوں دل گلچیں میں
بوئے گل مجھ سے ہے، رعنائی لالہ میں ہوں

میں غریبوں کی تمناؤں کا مرکز ہوں ضیاؔ
جس نے بخشا ہے اندھیروں کا اجالا میں ہوں

شکوہ یار طرحدار

عید کے دن
میرے شکوے
پیار کی تجدید ہیں
درد کی تمہید ہیں
یہ شکایت ہے
بغاوت تو نہیں
یہ محبت ہے
عداوت تو نہیں

نور سے بیزار ہیں
وہ رقیب روسیاہ
ظلمتوں کے پاسباں
روشنی سے بدگماں

حسینہ اُٹھے

بے وفا سرکشن بھی ہے
روک دو
اس کی زباں
حیف کتنا پست ہے، ان کا معیار وفا

آگیا ہے جشن کا روز سعید
خوش قدم، خوش آمدید
جی میں آتا ہے مبارک کہہ بھی دوں
ایک خدشہ ہے، رقیب کم نظر
میرے اخلاص و وفا کو
پیار کی تجدید کو
وہ خوشامد کہہ نہ دیں

ہے یہ تاکید خرد
ہو نہ تعریف حسین
اور نہ شکوے آ سکیں
میں غلام مصلحت
سوچتا ہوں اور کچھ دن چپ رہوں

خلا پہ شب خوں

زمیں سے چاند ستاروں کا فاصلہ دیکھو
خراج مانگ رہے ہیں یہ نقشِ پا دیکھو
جنونِ ذوقِ سفر کی ہے ابتدا دیکھو
خرد کے کربِ مسلسل کا حوصلہ دیکھو
حقیر ہستیٔ فانی حباب سا انساں
کمند پھینک رہا ہے، خلا میں جا دیکھو
جنوں ڈھونڈ رہا ہے بہشت کی راہیں
گناہ حضرتِ آدم کا سلسلہ دیکھو
خدا کا شکر ہے وہ خیریت سے آئے ہیں"
دعائیں مانگ رہی ہے کہیں وفا دیکھو
سرشت و جرأتِ انساں پہ مسکراتا ہے
فرازِ عرشِ معلیٰ سے پھر خدا دیکھو

جہاں یہ ہوش و جنوں کا حسین سنگم ہے
ہم اس مقام سے گزریں گے بار ہا دیکھو
حقیر کوشش ناچیز ہی سہی لیکن
دکھا رہے ہیں جو سورج کو ہم دیا دیکھو
ہیں ایک شمع کی دو لَو برائے اہل نظر
ضیاءِ جہاں ہے محبت وہاں خدا دیکھو

○

کچھ فرشتے ہیں اس کے ہم مشرب
تیری رحمت سے وہ بھی جیتا ہے
میں نے دیکھا ہے اس کا صبرِ جمیل
وہ تہجد کے وقت پیتا ہے

عمرِ تیز رفتہ کے
تیس سال تک میں نے
ایسے ریگ زاروں میں
روز گھاس کاٹی ہے
جن میں کچھ نہیں اُگتا
میں بھی انقلابی ہوں —

خیر مجھ کو جانے دو
میری سات پشتوں میں
ایک بھی نہ تھا ایسا
انقلاب کے ہیجے
ٹھیک سے جو کر پاتا
پھر بھی میرا دعویٰ ہے

میں بھی انقلابی ہوں ــــ

باپ ماں عزیزوں کی
نہ کبھی بھی عزت کی
نہ کبھی بھی خدمت کی
ملک و قوم و ملّت کی
گیت روز گائے ہیں
میں نے کھوکھلے نعرے
ہر جگہ لگائے ہیں
میں بھی انقلابی ہوں ــــ

ایک ایسی سیڑھی ہوں
جس پہ پیر رکھ رکھ کر
کتنے پستہ قد بونے
کرسیوں پہ جا پہنچے
میں غریب کی بیوی
ہر کسی کی بھابی ہوں
میں بھی انقلابی ہوں ــــ

احساسِ کمتری

آؤ!

ہم! اُسے صلیب پر چڑھائیں

کیوں؟ اُس نے کیا غلطی کی ہے

وہ ہمارا رہنما تھا

اُس نے غلط فیصلے کئے

جن کا خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑے گا

ہم نے سوچا تھا وہ مسیحا ہے

جو مردہ قوم میں روح پھونک دے گا

عصرِ حاضر کے فراعین کی غلامی سے نکا...

ہمیں آسمانوں تک جانے کا راستہ بتائے گا

جہاں خوشحالی ہے خوشی ہے اور سربلندی ہے

اُسے ہمارے دوسرے قبیلوں سے

جس عزم حوصلے اور عملی مدد کی توقع تھی

وہ پوری نہ ہو سکی

جرأت اور ہمت کی جگہ مصلحت نے لے لی
کھوکھلے نعرے اور جلوس اُس کے کسی
کام نہ آسکے
کسی نے اُس کی پشت میں چھرا گھونپ دیا
پھر بھی اُس نے پلِ صراط پر چلنے کی کوشش کی
مگر کٹ گیا
آؤ! ہم اُس کی پشت پر میں ایک اور خنجر اتاریں
ہماری نجات کی راہ یہی ہے
کہ ہم اُسے صلیب پر چڑھائیں
تاکہ ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا ہوسکے
شہید ضرور آسمان پر رہتے ہیں مگر
اُن کی قبریں زمین ہی پر بن سکتی ہیں

میری رگوں میں جو ہے خونِ وہ نہیں صالح
میں بھول بیٹھا ہوں کیا چیز ہے حلال و حرام
یہی سبب ہے کہ ہے بزدلی شعار میرا
نہ میرے دل میں ہے جرأت نہ ہے نظر بے باک
میرا شعار غلامانِ مصلحت میں ہے

اور اس پہ میرا یہ شکوہ کہ وقت کی آنکھیں
مجھے حقارت و نفرت سے دیکھا کرتی ہیں
اب آپ فیصلہ کیجیئے کہ کیا مناسب ہے؟

التمت بالخیر

تو ایک عام سی لڑکی ہے کوئی حور نہیں
کہ تیرا ذکر کتابوں میں بار بار آئے
ورق ورق تری پاکیزگی کے چرچے ہوں
جو شیخ نام سنیں دل کو کچھ قرار آئے

میں ایک راہ کا پتھر ہوں، کوہِ نور نہیں
حسین ملکۂ زریں کے سر کا تاج بنوں
وفا کے نام کا مطلب یہی سمجھتا ہوں
کہ تیرا پیٹ جو بھر جائے اپنا پیٹ بھروں

نہ ہو گی مجھ سے محبت تجھے نہ ہو لیکن
مرا یقین ہے تیرا جواب ہے اثبات
اگرچہ حسن یہ تیرے میں مر نہیں سکتا
مرا سوال ہے بن جا مری شریکِ حیات

This book is dedicated to:

1. Rev. Moulana Jalaluddin Roomi.
2. Dag Hammarksjoeld.
3. Dr. Iqbal.
4. U Thant.
5. Rabindranath Tagore
6. Rev. Mother Tressa.

and

7. Jimmy Carter

Zia Jabalpuri

OLD BUS STAND, KAMAREDDY,
INDIA - 503 111.